رئیس احمد جعفری

وہ جس کی یاد دل سے بھلائی نہ جائے گی

۱۹۵۹ء میں دفعتہً خلیفہ عبدالحکیم کا انتقال ہوگیا۔ وہ میرے مربی بھی تھے، محسن بھی اور نہایت اونچے درجے کے انسان بھی۔ انھوں نے میرا ترجمہ "آغانی" دیکھا تھا اور میری کتاب "تاریخ تصوف اسلام" کا مطالعہ کیا تھا۔ یہ کتاب پڑھ کر انھوں نے مری سے مجھے تعریف وتحسین کا ایک حوصلہ افزا خط لکھا اور اشتیاق ملاقات کا اظہار کیا۔ اتفاق کی بات کچھ روز بعد کراچی آئے۔ میرے دفتر پہنچے۔ میں صورت آشنا نہ تھا، پہچان نہ سکا۔ خود ہی اپنا تعارف کرایا۔ میں نے دیدہ و دل فرش راہ کر دیے۔ فرمایا، صدر میں فلاں مقام پر اپنے بھائی کے پاس ٹھہرا ہوں، صبح ناشتہ میرے ساتھ کیجیے، وہاں اطمینان سے باتیں ہوں گی۔

دوسرے روز میں خلیفہ صاحب کی قیام گاہ پر حاضر ہوا، وہ منتظر بیٹھے تھے، تپاک اور گرم جوشی سے پیش آئے۔ پھر کہنے لگے،

"لاہور چلیے، ہمیں آپ کی ضرورت ہے۔ ہم نے ایک دارالمصنفین بنایا ہے، مل کر کام کریں گے!"

میرا کراچی چھوڑنے کا جی نہیں چاہتا تھا عذر کر دیا، لیکن ان کا اصرار جاری رہا۔ آخر میں نے غور کرنے کے لیے کچھ مہلت مانگی۔ دوسرے دن وہ لاہور تشریف لے گئے۔ چند روز بعد گرامی نامہ آیا!،

"کیسے "غور" کر لیا آپ نے؟

میں نے غور کیا ہوتا تو جواب دیتا۔ کوئی سال بھر بعد، مولانا اختر علی خاں زمیندار کا چیف ایڈیٹر

بنا کر مجھے لاہور لائے، برگنزا ہوٹل میں میرا قیام تھا۔ لاہور آؤں اور خلیفہ صاحب سے نہ ملوں، یہ بدتمیزی ممکن نہ تھی۔ ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ پہلے سے زیادہ تپاک اور گرم جوشی سے ملے، کہنے لگے،

"فرمایئے، کیا ابھی تک غور کا سلسلہ جاری ہے؟"

میں نے عرض کیا،

"مجھے تو زمیندار کھینچ لایا ہے، اب کیا کر سکتا ہوں!"

کہنے لگے،

"بیک کرشمہ دو کار!"

میں نے سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھا، فرمانے لگے،

"زمیندار کی ادارت اپنی جگہ اور ادارے سے وابستگی اپنی جگہ، وہاں ایڈیٹوریل لکھیے، یہاں کتابیں"۔

میں نے زمیندار سے طے بھی یہی کیا تھا کہ صرف ایڈیٹوریل لکھوں گا، کسی اور ذمے داری سے مجھے سروکار نہ ہوگا۔ میں نے یہ پیش کش منظور کر لی۔ چند روز کے بعد پھر ملنے گیا۔ تو معلوم ہوا امریکہ تشریف لے گئے ہیں۔ میں نے دل میں سوچا چلو چھٹی ہوئی۔ اتنے میں ادارے کے ایک رفیق اور میرے پرانے دوست تشریف لائے۔ انھوں نے مجھے مبارک باد دی کہ ——— آپ بھی غالب ہمیں سے ہو گئے!"

معلوم ہوا امریکہ جانے سے پہلے صرف اس گفتگو کی بنیاد پر جو ان سے ہوئی تھی، میری درخواست یا تحریری منظوری لیے بغیر بورڈ آف ڈائرکٹرس سے میرا تقرر منظور فرما چکے تھے۔ اس التفات خاص نے مجھے ان کا گرویدہ بنا دیا، اور دوسرے دن سے میں نے باقاعدہ دفتر آنا شروع کر دیا۔

ایک دفعہ چودھری محمد علی صاحب ادارے تشریف لائے، ان کی خدمت میں مجھے پیش کرتے

ہوئے فرمایا،

"یہ بہت بھاگے لیکن ہم نے انھیں گرفتار کر ہی لیا"۔

خلیفہ صاحب جب تک زندہ رہے، ان کی شفقت و محبت سے بے انتہا شفقت و محبت سے میں بہرہ ور ہوتا رہا۔ چائے کے بعد جب مجلس جمتی تھی تو بہت سے مسائل زیر بحث آتے تھے۔ بلبل ہزار داستان کی طرح خود چہکتے تھے اور دوسروں کو اظہار خیال کا موقع دیتے تھے۔ میں نے بعض مسائل میں ان سے شدید اختلاف بھی کیا۔ انتہائی عالی ظرفی سے نہ صرف یہ کہ اسے برداشت کیا بلکہ نتیجۃً میرے معروضات کو شرف قبول بھی بخشا۔ مثلاً غیر مسکر حد تک شراب پینے کے جواز پر ایک صاحب کی رائے سے بہت خوش ہوئے۔ میں نے شدید اختلاف فقہ و سنت کی روشنی میں کیا، فوراً مان گئے، پھر کبھی یہ بات زبان پر نہ لائے۔

ایک مرتبہ خلیفہ صاحب دفتری شعبہ کے ایک صاحب کو بعض وجوہ سے الگ کر دینا چاہتے تھے لیکن مروت کے باعث صاف جواب بھی دینا نہیں چاہتے تھے آخر درمیانی راستہ یہ نکالا کہ ان کی تنخواہ ڈھائی سو سے سو روپیہ کر دی، جس کے بعد ظاہر ہے انھیں استعفا دے دینا چاہیے تھا۔ لیکن وہ اپنے حالات سے مجبور تھے استعفانہ دے سکے۔ سو روپے بھی قبول کر لیے۔ میرا دل ان کے حال زار پر کڑھا۔ لیکن یہ ایک خبر تھی جو میں نے سن لی، اور خاموش ہو رہا۔ دوسرے روز ہم لوگ چائے پر بیٹھے ہوئے تھے کہ ٹائپسٹ بورڈ آف ڈائرکٹرز کی کارروائی ٹائپ کر کے لایا کہ خلیفہ صاحب دستخط کر دیں۔ پھر دوسرے ڈائرکٹروں سے گشتی طور پر دستخط کرا لیے جائیں۔ میں نے عرض کیا،

"یہ ان صاحب کی تنخواہ جو ڈھائی سو سے سو روپے ہو گئی ہے یہ زیادتی ہے"۔

خلیفہ صاحب نے فرمایا،

"وہ تو ہو گئی، اب کیا ہو سکتا ہے؟"

میں نے ادب لیکن اصرار کے ساتھ عرض کیا،

"سب کچھ ہو سکتا ہے، کم سے کم ڈیڑھ سو کر دیجیے!"

کہنے لگے،

"بورڈ سے منظور کرا چکا ہوں!"

میں نے قلم ان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا،

"قانون آدمی کے لیے ہوتا ہے آدمی قانون کے لیے نہیں ہوتا۔ ذرا سوچیے تو سہی، اس غریب پر دل ہی دل میں کیا گزر رہی ہو گی۔ جہاں سو روپے درج ہیں، وہاں اپنے قلم سے سو کاٹ کر ڈیڑھ سو لکھ دیجیے، اور انیشیل کر دیجیے۔ ڈائرکٹر صاحبان میں سے کوئی صاحب بھی آپ پر معترض نہیں ہوں گے اور یہ کر کے آپ ثواب لوٹیں گے جس کا حصۂ رسدی ڈائرکٹر صاحبان کو بھی ملے گا۔"

خلیفہ صاحب نے قلم لے لیا، اور سو کاٹ کر -/۱۲۵ کر دیے کہنے لگے،

"فی الحال یہ، بعد میں پھر دیکھا جائے گا۔"

یہ ماحول تھا جس میں خلیفہ صاحب کے زیر سایہ میں زندگی بسر کر رہا تھا۔ اب ان کی جگہ میاں محمد شریف ڈائرکٹر ہو کر تشریف لائے تھے۔

میاں صاحب جب تک فلاسوفیکل کانگرس کے صدر تھے، صرف چند بار سرسری ملاقات ہوئی، جو رسمی حدود سے متجاوز نہ ہو سکی۔ بعض وجوہ سے جن کی تشریح کا یہ موقع نہیں، وہ مجھ سے کچھ کشیدہ سے تھے۔ میرے کانوں تک یہ بات پہنچی۔ لیکن میں نے اسے کوئی اہمیت نہیں دی ——— کیوں دیتا؟

میاں صاحب کا تقرر، اس وقت ہوا جب میں حسب معمول گرمی گزارنے اور اپنا تحریری کام کرنے کے لیے کوئٹہ گیا ہوا تھا۔

ایک دوست نے دفتر سے مجھے خط لکھا،

"میاں صاحب ڈائرکٹر ہو کر تشریف لے آئے ہیں، مناسب اور تقاضائے مصلحت یہ ہے کہ آپ فوراً واپس آ جائیں!"

میں نے جواب دیا،

" میاں صاحب نے بلایا تو آجاؤں گا، ورنہ نہیں !"

دس پندرہ روز کے بعد میاں صاحب کا ایک اکھڑا اکھڑا سا خط میرے پاس کوئٹہ پہنچا، جس میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ میں انھیں اپنی کارگزاری کی اطلاع دوں، کیا کر رہا ہوں اور کہاں تک پہنچا ہوں؟

خط کے اکھڑے اکھڑے لہجہ سے مجھے تکلیف ہوئی، میں نے جواب میں لکھا، وہی کام کر رہا ہوں جو مجھے خلیفہ صاحب نے تحریری منظوری سے سونپا تھا اور اب قریب الختم ہے، لاہور آکر پیش کر دوں گا،

آخر میں اقبال کا یہ شعر بھی لکھ دیا:

حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے
عکس اس کا مرے آئینۂ ادراک میں ہے

اس کا کوئی جواب نہیں ملا۔ میں کوئٹہ میں مقیم رہا، اور پروگرام کے مطابق اکتوبر میں لاہور آگیا۔

لاہور آنے کے بعد، دو تین روز میاں صاحب سے سوا سرسری اور رسمی ملاقات کے کوئی بات چیت نہیں ہوئی۔ ایک روز اپنے کمرے میں بیٹھا تھا کہ انھوں نے یاد فرمایا،

مجھے اپنے سامنے کھڑا دیکھ کر فرمایا،

"تشریف رکھیے" اور پھر سوال کیا،

" ہاں تو کیا کام کیا ہے آپ نے ؟"

میں نے عرض کیا،

" امام ابویوسف اور امام محمد کے فقہی اجتہادات ——————

قطع کلام کرتے ہوئے میاں صاحب نے فرمایا:

" یہ کتاب تو پھر فقہ پر ہوئی !"

" جی ہاں کسی حد تک، ورنہ دراصل اس کا موضوع ——————

"اس میں آپ نے ثابت کیا ہوگا کہ نماز پانچ وقت کی پڑھنی چاہیے، روزے ایک مہینے کے فرض ہیں، اور قربانی واجب ہے، ——"

ان باتوں سے میں کچھ چکرا سا گیا۔ اگرچہ میری کتاب کا تعلق فقہی اجتہادات اور مذکورہ ائمہ کے احوال و سوانح سے تھا نہ کہ فقہی مسائل اور ان کے کلیات و جزئیات سے لیکن میں نے ان کے خیال کی تردید نہیں کی بلکہ کہا،

"ظاہر ہے احکام، فرائض اور واجبات میں کمی بیشی کا اختیار تو شرع اسلامی نے کسی کو نہیں دیا ہے، اسی لیے اس بجور دروازے کا بھی قائل نہیں ہوں جس کی رو سے قرآن کی بعض آیات کو منسوخ قرار دیا جاتا ہے۔ یہ عقیدہ قرآن اور خدا دونوں کی توہین ہے!"

"لیکن بحث یہ نہیں، یہ ہے کہ آپ نے وہی چیزیں ثابت کی ہوں گی جن کی طرف میں نے ابھی اشارہ کیا ہے!"

جی ہاں —— ظاہر ہے احکام اور واجبات و فرائض میں کمی بیشی کا اختیار کسی کو نہیں ہے"

"لیکن ہمارے پاس ایک ایسی کتاب بھی برائے غور موجود ہے، جس میں پانچ کے بجائے دو وقت کی نمازیں ثابت کی گئی ہیں، روزے کی حیثیت رضاکارانہ ہے، اور قربانی کے وجوب سے انکار کیا گیا ہے۔ اس کتاب کی اشاعت میں مجھے تامل ہے لیکن اگر ہوئی تو کیونکر ممکن ہے کہ ایک ہی ادارے سے دو متضاد افکار و نظریات کی کتابیں شائع ہوں؟"

بجا فرمایا، —— بہرحال میں نے اپنا کام مکمل کر لیا، اب اگر کسی وجہ سے آپ اس کی اشاعت مناسب نہیں سمجھتے تو اس کی اشاعت ملتوی یا منسوخ کر سکتے ہیں، کتاب کی طباعت و اشاعت کی ذمے داری سے میں بری ہوں۔ لیکن چونکہ ادارے سے وابستہ ہوئے، ایک طویل مدت گزر چکی ہے، اس لیے اس سے محبت ہو گئی ہے، اور اس محبت کا تقاضا یہ ہے کہ بطور مشورہ ایک بات عرض کر دوں!"

"فرمایئے میں سن رہا ہوں!"

"میری ادب کے ساتھ، اور انتہائی اصرار کے ساتھ درخواست یہ ہے کہ جس کتاب کا آپ نے ذکر فرمایا ہے اسے شائع نہ فرمائیں۔ اس سے عوام بھڑک اٹھیں گے اور کوئی وجہ نہیں ہے کہ حکومت بھی ناخوشی کا اظہار نہ کرے۔ بے شک انفرادی طور پر ہر شخص کو اظہار خیال کی آزادی حاصل ہے۔ ایک شخص کو اگر اسلام میں صداقت نظر نہیں آتی تو وہ اپنے خیالات کا اظہار سنجیدگی اور دلائل کے ساتھ کر سکتا ہے لیکن یہ کام حکومت کے صرف پر نہ ہونا چاہیے۔ حکومت ادارے کی سرپرستی اس لیے کرتی ہے کہ اسلام کو، اس کے اقدار کو، اس کی تہذیب و ثقافت کو، اس کی تاریخ اور مباحث کو اصلی آب و رنگ کے ساتھ پیش کیا جائے، اس لیے تو سرپرستی نہیں کرتی کہ اسلام کے بنیادی تصورات کو عمل متواتر کو، سنت کو ــــــ میں سنت کا لفظ استعمال کر رہا ہوں، حدیث کا نہیں ــــــ مسخ کر کے پیش کیا جائے۔ اگر کسی شخص میں یہ جرأت ہے کہ وہ ان چیزوں کا انکار کرے، تو اس میں یہ اخلاقی جرأت بھی ہونی چاہیے کہ خواہ فاقہ کرنا پڑے لیکن ادارے کے کندھے پر رکھ کر بندوق نہ چلائے۔ بطور خود اور بہ مصارف خود یہ کام کرے۔"

یہ گزارشات سن کر میاں صاحب کا رنگ رخ متغیر ہو گیا، وہ کچھ برہم سے نظر آنے لگے، فرمایا،

"آخر اسلام کی وہی تعبیر کیوں صحیح ہو جو آپ کرتے ہیں؟ دوسروں کو یہ حق کیوں نہیں ہے؟"

میں نے عرض کیا،

"یہ حق ہر شخص کو ہے، لیکن ہر حق مطلق نہیں ہوتا۔ اسے استعمال کرنے کے کچھ حدود بھی ہوتے ہیں، اور ان کی پابندی ناگزیر ہوتی ہے۔ اسلام کی بنیاد درحقیقت دو چیزوں پر ہے، قرآن اور عمل متواتر ــــــ عمل متواتر ہر روایت، ہر سند، ہر سلسلۂ رواۃ سے اعلیٰ اور ماوراء ہے۔ فرض کیجیے ایک ثقہ ترین راوی، جس کے "عدول" ہونے پر اصحاب جرح و تعدیل کا اتفاق ہے، اور جو مطلقاً مجروح نہیں ہے، روایت کرتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز فجر معاف کر دی تھی، تو محض اس کے ثقہ ہونے اور سلسلۂ روایت کے درست ہونے

کی بنا پر یہ روایت قبول نہیں کر لی جائے گی، بلکہ رد کر دی جائے گی۔ اس لیے کہ عمل متواتر اس .... کے خلاف گواہی دے رہا ہے۔ عہدِ رسالت سے لے کر آج تک بغیر کسی انقطاع کے نمازِ فجر پر عمل درآمد ہوتا چلا آ رہا ہے۔ اشخاص و افراد فہمِ معانی میں غلطی کر سکتے ہیں، بیانِ روایت میں غلطی کا احتمال ہے، استنتاج میں چوک ہو سکتی ہے۔ وقت، مصلحت اور حالات سے وہ مغالطے میں مبتلا ہو سکتے ہیں۔ لیکن عمل متواتر نہ غلط فہمی میں مبتلا ہو سکتا ہے، نہ اس سے چوک ہو سکتی ہے۔ چنانچہ علمائے اصولِ حدیث بھی عمل متواتر کی عظمت اور اہمیت کو تسلیم کرتے ہیں۔ اسی روشنی میں نماز کو لیجیے۔ کیا چودہ سو برس میں یعنی عہدِ رسالت سے آج تک پانچ وقت سے کم یا زیادہ پڑھی گئی؟ روزے کو لیجیے، ہم اسو برس سے وہ رضا کارانہ طور پر رکھا جا رہا ہے، یا فرض سمجھ کر؟ یہی حال قربانی کا ہے۔ اب اگر کوئی شخص اس عمل متواتر کے خلاف اپنی تحقیق کی عمارت کھڑی کرتا ہے تو کرے لیکن کم از کم ادارے کو اس گناہ میں شریک نہ ہونا چاہیے۔"

میاں صاحب نے ذرا زیادہ برہم ہو کر پوچھا،

"کیا آپ تحقیق کا دروازہ بند کر دینا چاہتے ہیں؟"

میں نے عرض کیا،

"جی نہیں، البتہ تحقیق کے نام پر اباحت اور افتراق بین المسلمین کا دروازہ ضرور بند کر دینا چاہتا ہوں ——— اگر میرے ہاتھ میں طاقت ہو!"

"آپ کے ہاتھ میں طاقت ہو تو آپ کیا کریں گے؟"

"اس طرح کے مسودات ضائع کر دوں گا، ایسے محققین کو میں گوارا نہیں کر سکتا جو بر خود غلط ہیں، جانتے کم ہیں اور بنتے زیادہ ہیں۔ میاں صاحب مجدد الف ثانی کے پرستار ہیں، کوئی صاحب شاہ ولی اللہ کا پرچم ہاتھ میں لیے ہوئے ہیں۔ مبلغ علم کا یہ حال ہے کہ نہ تاریخ سے واقف نہ مذہب سے نہ فلسفۂ مذہب سے، نہ مجددی کیفیات اور ولی اللہی واردات سے۔ "حجۃ اللہ البالغہ" پر صحیح اعراب لگانا بھی مشکل، نہ کہ شاہ صاحب کی واردات کو سمجھ لینا۔ جب کہ خود شاہ صاحب کا

عالم اپنے واردات کے بارے میں یہ ہے کہ:

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی!

فکر کی بنیاد قرآن اور عمل متواتر ہونا چاہیے۔ اسی فکر کے فروعات میں فکر ولی اللّٰہی، فکر مجددی فکر رومی، فکر غزالی وغیرہ سب چیزیں آسکتی ہیں، لیکن اپنی انفرادیت، شخصیت اور تشخص کے لیے اکابر رجال میں سے کسی ایک کو لے لینا اور صفت حواں طے کرنے لگنا، یہ اسلوب بنیادی طور پر غلط ہے، اور یہیں سے کجی فکر اور اضطراب فکر کے سوتے پھوٹتے ہیں"۔

"آپ کی ان تمام باتوں سے میں نے تو یہی نتیجہ نکالا ہے کہ آپ تحقیق کا دروازہ بند کردینا چاہتے ہیں!"

میں نے جواب میں عرض کیا،

"تحقیق کا دروازہ بند کرنے کی دوسروں کو ضرورت ہے جن کا دامن الوان نعمت سے خالی ہے۔ میرے اسلام کے پاس کیا نہیں ہے؟ میرا اسلام کیا نہیں دیتا؟ میرے اسلام نے عورتوں کو وہ حقوق دیے ہیں، جو آج بھی دنیا کی مہذب قومیں نہیں دے سکی ہیں۔ میرے اسلام نے عدل وانصاف کی وہ مثالی قائم کی ہے جس کی مثال وہائٹ ہاؤس اور ڈاؤننگ اسٹریٹ کہیں بھی نہیں ملتی!"

میاں صاحب نے مداخلت کرتے ہوئے فرمایا،

"آخر آپ چاہتے کیا ہیں؟"

میں نے عرض کیا،

"صرف اتنا کہ تحقیق کے نام پر اسلام کی غلط ترجمانی نہ کی جائے"۔

میاں صاحب بپھر گئے، فرمانے لگے،

"آپ اتنے تنگ نظر ہیں تو ہمارا آپ کا گزر کیسے ہوسکے گا؟"

میں نے جواب میں کہا،

"وہ تو واقعی بہت مشکل بلکہ ناممکن نظر آرہا ہے!"

اتنے میں کچھ اور لوگ آ گئے، بات ختم ہو گئی۔ میں گھر چلا گیا، لیکن اس گفتگو نے میرے ذہن و اعصاب پر اتنا زیادہ اثر کیا تھا کہ تین چار روز تک دفتر نہیں آیا، ایک روز میاں صاحب کا پیام پہنچا کہ یاد فرمایا ہے۔ دوسرے روز میں حاضر ہوا۔ آج رنگ ہی کچھ اور تھا۔ جن آنکھوں سے میں نے عتاب اور برہمی کی چنگاریوں کی نزاوش دیکھی تھی، آج وہی شفقت و رحمت کا منبع بنی ہوئی تھیں۔ کوئی کاغذ پڑھ رہے تھے مجھے دیکھ کر نظر جھکا لی، پھر مطالعہ میں مصروف ہو گئے۔ ذرا دیر کے بعد اس سے فارغ ہوئے، اور صوفے پر آ کر بیٹھ گئے۔ مجھے بھی اپنے پاس بٹھا لیا، اور پوچھا

"کب تک خفا رہیں گے!"

مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا، بعض اوقات کڑی سے کڑی تعزیر بھی وہ اثر نہیں کرتی جو شفقت اور رحمت کے چند میٹھے بول کر دیتے ہیں۔ ابھی میں نے کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ میاں صاحب نے فرمایا،

"آپ کی نیک نیتی اور دیانت فکر کی میں قدر کرتا ہوں۔ اگر آپ اس لیے نہیں آئے تھے کہ اب نہیں آئیں گے، تو میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ آپ کی ہر بات مان لوں، لیکن اس پر غور نہ کروں یہ نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ (مسکرا کر فرمایا) نمازیں پانچ ہی وقت کی رہیں گی!"

میاں صاحب قرآن مجید پڑھتے تھے، اس پر تدبر بھی کرتے تھے۔ تفاسیر سے استفادہ بھی کرتے تھے۔ رفقائے ادارہ سے مشورہ بھی کرتے تھے۔ لیکن کسی مذہبی مسئلے سے متعلق رائے قائم کرنے اور کسی فیصلے تک پہنچنے سے پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا کہ اس نالائق اور ناچیز سے بھی انھوں نے باقاعدہ مشورہ نہ کر لیا ہو۔ کئی دفعہ ایسا بھی ہوا کہ انھوں نے

اپنا نقطۂ نظر تسلیم کرا لیا، لیکن دبدبے کے ساتھ نہیں، دلائل کے ساتھ، اور ہم میں سے کسی کا نقطۂ نظر بھی تسلیم کر دیا، لیکن خوب اچھی طرح تمام پہلوؤں پر غور کر کے اور مسئلے کی تہہ تک پہنچ کر۔ ان کی انسانیت اور شرافت کے پہلو روز بہ روز اجاگر ہوتے گئے، اور اسی تناسب سے ان کی عظمت میرے دل میں پیوست ہوتی گئی۔ رفتہ رفتہ دوئی کا پردہ اٹھتا گیا اور اپنا ئیت کی کارفرمائی بڑھتی گئی۔ قلب کی کسی کارگر اور موثر دوا کا کسی مستند ذریعہ سے انھیں پتہ چلتا تو اس کا نام مجھ تک پہنچانے کے لیے پریشان رہتے۔ بعض دفعہ میں دو دو دن تک دفتر نہ آتا، دوا کا نام شیشے کے تختے کے نیچے نمایاں حروف میں محفوظ رکھتے اور دیکھتے ہی نوٹ کرا دیتے۔ اکثر ایسا بھی ہوتا کہ اس کا لٹریچر بھی عطا فرما دیتے۔ اپنے تجربے بھی بتاتے رہتے تھے۔ ایک مرتبہ فرمایا کہ کارونری تھرامبوسس کے مریضوں کا بلڈ پریشر عام طور پر لو رہتا ہے۔ کبھی کبھی زیادہ ہو جاتا ہے۔ لندن میں ایک ماہر قلب ڈاکٹر نے مجھے بتایا تھا کہ ایسے موقعہ پر ایک چمچہ برانڈی کا گرم پانی کے ساتھ پی لینا چاہیے۔

میاں صاحب کا انتقال دسمبر ۷۵ء میں ہوا۔ نومبر کے پہلے ہفتے میں شام ہمدرد کے سلسلے میں میری ایک تقریر تھی۔ وہ جلسے میں تشریف لائے اور آخر وقت تک بیٹھے رہے مغرب کی نماز باجماعت میں شریک ہوئے۔ نماز سے فارغ ہو کر میں باہر نکل رہا تھا کہ میں نے دیکھا میاں صاحب مصلّے کے پاس کچھ نڈھال سے کھڑے ہیں۔ جوتے کے بند باندھنا چاہتے ہیں مگر جھکنے میں کچھ تکلیف سی محسوس کرتے ہیں۔ مجھے خود یہ تکلیف مستقل طور پر ہے چنانچہ نماز بیٹھ کر پڑھتا ہوں اور رکوع و سجود اشارے سے کرتا ہوں۔ میاں صاحب کی کیفیت میں نے بھانپ لی۔ وہ نہیں نہیں کرتے رہ گئے، مگر ہجوم عام میں، بے تامل زمین پر بیٹھ کر میں نے ان کے جوتے کے بند باندھ دیے۔

دوسرے روز دفتر تشریف لائے تو بڑی دیر تک میری تقریر کا حوصلہ افزا الفاظ

میں ذکر فرماتے رہے اور مولانا محمد علی کی علی گڑھ کی داستانیں مزے لے لے کر بیان کرتے رہے۔

جس روز میاں صاحب کی وفات ہوئی وہ حسب معمول اپنی نواسی کو کالج تک پہنچانے کار پر تشریف لے گئے۔ واپسی میں کار سروس کے لیے دے دی۔ کچھ دور پیادہ چلے۔ سینہ میں درد محسوس ہوا مگر حسب عادت پروانہ کی۔ یہاں تک کہ چند قدم چلنے کے بعد محسوس کرنے لگے اب گر جائیں گے۔ اتفاق سے ایک خالی رکشا ادھر سے گزرا، اس پر بیٹھ کر دفتر آگئے، اور صوفے پر لیٹ گئے۔ چہرہ بالکل اترا ہوا تھا۔ معلوم ہوتا تھا خون کا ایک قطرہ بھی نہیں ہے۔ کرب و اذیت کے آثار بھی نمایاں تھے۔ مگر لیٹے لیٹے کام کرتے رہے۔ فون ریسیو کرتے رہے۔ ہم لوگ مانگا تہذیب الاخلاق ٹرسٹ کی نو تعمیر عمارت دیکھنے جا رہے تھے۔ اصرار کے ساتھ ہمیں جانے کی تاکید کی۔ میں ہر تھوڑی دیر کے بعد کسی بہانے سے ان کے کمرے میں جاتا اور خیریت پوچھتا تھا۔ ہر دفعہ مطمئن کر دیتے تھے۔ آخر ہم لوگ مانگا چلے گئے۔ وہاں سے شام کو واپسی ہوئی۔ اپنے ایک رفیق کار سے میں نے فون کرایا تو معلوم ہوا ٹھیک ہیں۔ صبح کو حسب معمول دفتر پہنچا تو فضا کچھ اداس اداس سی نظر آرہی تھی۔ سب سے پہلے فتح محمد مالی سے مڈبھیڑ ہوئی۔ اس نے بتایا،

"میاں صاحب، رات گزر گئے۔"

چکر سا آگیا۔ فوراً کرسی پر بیٹھ گیا۔ یقین نہیں آتا تھا کہ زندگی اور جوش زندگی کا وہ پیکر اس خاکدان سے یوں دفعۃً رخصت ہو جائے گا۔ لیکن یہ افواہ نہ تھی حقیقت تھی۔

پھر ہم لوگ میاں صاحب کے گھر پہنچے۔ آخری منزل کی تیاریاں ہو رہی تھیں، آہ!

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے
کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور